TAHREER
Journal of Languages & Literature
eISSN:3007-2085
pISSN:3007-2077
تحریر
Vol. 3 No. 4 (2025) HEC approved in the Y category.

'Cultural and Social Context' and 'Individual Consciousness of the Historian' in Urdu Literary Historiography: A Comparative Study of Methodology

اردو ادبی تاریخ نگاری میں 'تہذیبی و سماجی سیاق' اور 'مورخ کا انفرادی شعور': منہاجیات کا تقابلی مطالعہ

Muhammad Nisar-ul-Haq Alvi[1], Dr Azim Ullah Jundran[2]
[1]M.Phil. Scholar, [2]Assistant Professor, Dept. of Urdu, Superior University, Faisalabad.
Correspondence: aujundran@gmail.com

Abstract
This research paper presents a critical and comparative analysis of the methodologies employed in Urdu literary historiography, tracing its evolution from traditional chronicle writing (Tazkira tradition) to the modern concept of "Cultural Totality." Focusing primarily on the historiographical contributions of Dr Saleem Akhtar, Dr Tabassum Kashmiri, and Dr Jameel Jalibi, the study investigates the dialectical relationship between the "Socio-Cultural Context" and the "Historian's Individual Consciousness." The paper challenges the traditional demand for absolute neutrality, arguing in favour of Dr Saleem Akhtar's stance that a historian's subjective opinion, decisiveness, and psychoanalytical insight are indispensable for interpreting literary history. Furthermore, it examines the conflict in linguistic historiography between the dry, technical principles of structural linguistics and the socio-cultural approach that views language evolution through the lens of social conditioning. The study also re-evaluates the philosophy of periodisation, advocating for the application of Hegel's concept of Zeitgeist (Spirit of the Age) over linear, dynastic divisions, citing Allama Iqbal as the quintessential embodiment of the "Interim Period." Finally, the paper analyses the stylistic divergence between the "Encyclopedic" detail of Jameel Jalibi and the "Capsule" (concise) historiography of Saleem Akhtar, concluding that a synthesis of psychological depth and sociological breadth is essential for the future of Urdu literary history.

Keywords:
Urdu Literary Historiography, Cultural Totality, Psycho-analytical Criticism, Socio-Political Context, Linguistic Historiography.

Received: 08-11-2025 **Accepted:** 28-12-2025 **Online:** 10-01-2026

This article is licensed under the Creative Commons Attribution (CC BY 4.0). Free use, distribution, and reproduction permitted with proper citation of the original work.
© The Author(s).

اردو ادبی تاریخ نگاری کا سفر محض ماضی کے واقعات کی بازیافت یا ایام شماری کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا زندہ اور نامیاتی عمل ہے جس میں ''مورخ کا انفرادی شعور'' اور ''تہذیبی و سماجی سیاق'' باہم دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ روایتی تاریخ نویسی میں، جس کی مثالیں ہمیں ابتدائی تذکروں یا محض کوائف پر مبنی کتب میں ملتی ہیں، مورخ کا کام صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ غیر جانبدار رہ کر سنین اور وفیات کا اندراج کر دے۔ تاہم، بیسویں صدی کے وسط کے بعد، بالخصوص ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر سلیم اختر کے ظہور کے ساتھ، تاریخ نگاری کا منہاج یکسر تبدیل ہو گیا۔ زیرِ نظر مقالہ اس بنیادی سوال کا احاطہ کرتا ہے کہ ایک ادبی مورخ کس طرح ''تہذیبی کلّیت'' اور ''انفرادی و نفسیاتی شعور'' کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔ اس مطالعے میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آیا تاریخ کو ایک غیر شخصی سائنسی دستاویز ہونا چاہیے یا اسے مورخ کی ذاتی رائے، نفسیاتی تجزیے اور افسانوی اسلوب کا مرقع ہونا چاہیے۔ ہم اس تحقیقی جائزے میں دبستانِ لکھنؤ، لسانی مباحث اور ادوار کی تقسیم (Periodization) کے حوالے سے ان مورخین کے مختلف اور متضاد رویوں کا تقابلی مطالعہ کریں گے تاکہ اردو ادبی تاریخ نگاری کے ارتقائی سفر اور اس کے موجودہ رجحانات کا تعین کیا جا سکے۔

ادبی تاریخ نگاری کا فن محض ماضی کے واقعات کو ترتیب دینے یا سنین کی فہرست سازی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسا زندہ اور نامیاتی عمل ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ارتقائی منازل طے کرتا رہا ہے۔ تاریخ کے ابتدائی تصورات میں اسے صرف ''ایام شماری'' یا ''حوادث کی ریاضی'' سمجھا جاتا تھا، جہاں مورخ کا کام محض یہ تھا کہ وہ بادشاہوں کے ادوار، جنگوں کے نتائج اور شعرا کی وفات و پیدائش کی تواریخ کو محفوظ کر لے۔ تاہم، جدید ادبی شعور نے اس محدود تصور کو رد کرتے ہوئے ادبی تاریخ کو ایک وسیع تر ''تہذیبی کلّیت'' (Cultural Totality) کے تناظر میں دیکھنے کی طرح ڈالی ہے۔ اس سفر میں ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ نگاری خشک کوائف سے نکل کر سماجی، سیاسی، نفسیاتی اور تہذیبی عوامل کے ایک پیچیدہ مرکب کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ تاریخ کی اس بنیادی تعریف اور ارتقا کے حوالے سے ای۔ ایچ۔ کار کا یہ نظریہ اہمیت کا حامل ہے کہ تاریخ ماضی کو حال کی آنکھ سے دیکھنے کا نام ہے۔

اردو ادبی تاریخ نگاری کی روایت میں ایک طویل عرصے تک ''واقعہ نگاری'' اور ''تحقیقِ متن'' کا رجحان غالب رہا۔ اس مکتبِ فکر کے نزدیک تاریخ کا بنیادی وظیفہ یہ تھا کہ وہ مستند کوائف فراہم کرے اور تنقید یا تعبیر سے گریز کرے۔ رشید حسن خاں اور گیان چند جین جیسے محققین کا اصرار تھا کہ ادبی تاریخ کو تنقید سے الگ رہنا چاہیے اور اس کا دائرہ کار صرف صحیح سنین، متن کی درستی اور واقعات کے اندراج تک محدود ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک تاریخ کی دیانت داری اسی میں تھی کہ وہ ''کیا ہوا'' کا جواب دے، نہ کہ ''کیوں ہوا'' کا۔ اس رجحان کے تحت لکھی گئی تاریخیں معلومات کا انبار تو تھیں مگر ان میں اس روح کی کمی تھی جو ادب کو سماج اور تہذیب سے جوڑتی ہے۔ اس محدود نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا گیا ہے:

> ''ادبی تاریخ کو سب سے پہلے تاریخ ہونا چاہیے۔ اس میں صحیح سنین دینے پر خاص توجہ کرنی چاہیے۔ کسی مصنف کا سنِ ولادت، سنِ وفات اور زندگی کی دوسرے اہم واقعات مثلاً ایک مقام سے دوسرے مقام پر ہجرت کی تاریخیں دینی

چاہئیں۔"(1)

تاہم، وقت گزرنے کے ساتھ ادبی مورخین نے محسوس کیا کہ ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک پورے تہذیبی نظام اور سماجی ڈھانچے کا پرتو ہوتا ہے۔ چنانچہ عبدالقادر سروری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر سلیم اختر جیسے مورخین نے تاریخ نگاری کو "واقعہ نگاری" سے نکال کر "تہذیبی کلّیت" کی طرف موڑ دیا۔ اس نئے منہاج کے تحت ادب کو سیاسی اتھل پتھل، معاشی حالات، لسانی تغیرات اور اجتماعی نفسیات کے پس منظر میں پرکھا جانے لگا۔ عبدالقادر سروری نے اس بات پر زور دیا کہ ادبی مظاہر کو سیاسی اور سماجی ماحول سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ ارتقائی سفر اس شعور کا نتیجہ تھا کہ ادبی تاریخ کو زندگی کے دیگر شعبوں کے ساتھ مربوط کر کے ہی ایک بامعنی بیانیہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

تہذیبی کلّیت کے اس تصور کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے مزید وسعت دی اور ادبی تاریخ کو "اجتماعی و تہذیبی روح" کا عکس قرار دیا۔ ان کے نزدیک تاریخ کا کام بکھرے ہوئے واقعات کو ایک لڑی میں پرونا اور ان کے درمیان پوشیدہ رشتوں کو دریافت کرنا ہے۔ یہ محض ماضی کا ریکارڈ نہیں بلکہ حال کا ماضی سے مکالمہ ہے۔ اس ارتقائی عمل میں مورخ نے یہ سمجھا کہ ایک فن پارہ صرف لفظی بازی گری نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی تہذیب کے عروج و زوال، فکری روایات اور معاشرتی اقدار کا امین ہوتا ہے۔ لہٰذا، ادبی تاریخ کو ان تمام روایات اور محرکات کا احاطہ کرنا چاہیے جو کسی تخلیق کے وجود میں آنے کا سبب بنتے ہیں۔

اس ارتقائی سفر میں ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تاریخ نگاری کو مزید سائنسی اور ہمہ گیر بنیادوں پر استوار کیا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اقتصادیات، دیومالا، اور فلسفے کو بھی ادبی تاریخ کا حصہ بنایا، جبکہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اسے جغرافیائی اور نفسیاتی عوامل کے ساتھ جوڑ دیا۔ سلیم اختر کے نزدیک ادبی تاریخ "تخلیق اور تخلیق کار" کے مطالعے کا نام ہے جو وقت کے جبر کے خلاف انسانی مزاحمت کی داستان ہے۔ وہ تاریخ کو ایک ایسے کینوس کے طور پر دیکھتے ہیں جہاں جغرافیائی حدود، لسانی مضمرات اور اقتصادی عوامل مل کر ایک "ذہنی تناظر" تشکیل دیتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر واقعہ نگاری کی خشک زمین سے اٹھ کر تہذیبی تجزیے کی بلندیوں تک ادبی تاریخ کا سفر ہے۔

ادبی تاریخ نگاری کے فلسفے میں یہ بحث ہمیشہ سے کارفرما رہی ہے کہ آیا مورخ کو ایک غیر جانبدار مبصر کی طرح محض حقائق کی ترسیل کرنی چاہیے یا اسے ایک منصف کی طرح اپنی ذاتی رائے اور فیصلے صادر کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے۔ روایتی مکتبِ فکر، جس کی نمائندگی گیان چند جین اور رشید حسن خاں جیسے محققین کرتے ہیں، کا اصرار رہا ہے کہ ادبی تاریخ اور تنقید دو الگ الگ شعبے ہیں۔ ان کے نزدیک تاریخ کا کام صرف سنین، وفیات اور کتب کی اشاعت کے درست کوائف فراہم کرنا ہے، اور ذاتی رائے یا تنقیدی محاکمہ تاریخ کی معروضیت کو مجروح کرتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق مورخ کی انفرادی سوچ کو حقائق کے بیان پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔

اس کے برعکس، جدید ادبی مورخین، بالخصوص ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری، تاریخ کو محض کوائف کا قبرستان بنانے کے خلاف ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ تاریخ نویسی میں مورخ کا 'انفرادی شعور' اور 'ذاتی رائے' ایک ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر

کے نزدیک تحقیق میں غلطی یا مواد کی کمی بیشی ایک خارجی نقص ہے جسے معاف کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر مورخ کے پاس اپنی ذاتی رائے اور فیصلے کی قوت نہیں ہے، تو یہ ایک داخلی اور ناقابل معافی جرم ہے۔ ان کے نزدیک تاریخ میں تنقید کا رس اور معنویت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب مورخ حقائق کو اپنے انفرادی شعور کی بھٹی سے گزار کر پیش کرتا ہے۔ وہ غیر جانبداری کے اس مصنوعی خول کو توڑتے ہیں جو مورخ کو گونگا بنا دیتا ہے، اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تاریخ محض واقعات کا انبار نہیں بلکہ مورخ کے ذہن میں ترتیب پانے والا ایک بیانیہ ہے:

> ''فراہمی مواد میں تساہل سے در گزر کیا جا سکتا ہے، کوائف میں اغلاط اور تحقیق کے نقائص گوارہ کئے جا سکتے ہیں (کہ یہ خارجی ہیں) مگر ذاتی رائے کا فقدان ناقابل معافی ہے (کہ یہ داخلی ہے) تاریخ میں تنقید کا رس بھی اسی سے پیدا ہوتا ہے، رائے کی درست یا نادرست یا متنازعہ ہونے سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ رائے بہر حال ذاتی ہی تو ہوتی ہے، رائے اگر کسی تنقیدی نظریہ پر استوار ہو تو پھر دیگر حضرات کے لئے اس کے مقبول یا نامقبول ہونے سے بھی کوئی خاصا فرق نہیں پڑتا کہ ادبی نقاد کی مانند ادبی مورخ نے بھی رائے ہی کی صورت میں فیصلہ صادر کرنا ہوتا ہے''۔(2)

مورخ کا انفرادی شعور دراصل وہ روشنی ہے جو ماضی کے تاریک گوشوں کو منور کرتی ہے۔ جب ایک مورخ بکھرے ہوئے واقعات اور غیر مرتب تصورات کو دیکھتا ہے، تو یہ اس کا ویژن (Vision) ہی ہوتا ہے جو ان بے ربط اجزا کو ایک بامعنی تصویر میں بدلتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس نکتے کو بہت خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے کہ ادبی تاریخ محض حقائق کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ یہ مورخ کی ذہنی بصیرت کا کرشمہ ہوتی ہے جو کسی عہد، رجحان یا شخصیت کو ایک نئے تناظر میں زندہ کرتی ہے۔ اگر مورخ اپنا انفرادی شعور استعمال نہ کرے تو تاریخ محض مردہ اعداد و شمار کا ڈھیر بن کر رہ جائے گی۔ لہٰذا، ذاتی رائے کی شمولیت تاریخ کو سبجیکٹو (Subjective) بنانے کے بجائے اسے بامعنی اور مربوط بنانے کا عمل ہے۔ بقول تبسم کاشمیری:

> ''ادبی مؤرخ کا کام صرف واقعات اور حقائق تک محدود نہیں ہے۔ وہ واقعات اور حقائق سے آگے بڑھ کر ایک اور اہم فریضہ انجام دیتا ہے۔ واقعات و حقائق اور تاریخ کے مطالعہ سے وہ ادبی تاریخ کے کسی دور، رجحان، نظریے یا کسی شخصیت کے بارے میں ایک وژن مہیا کرتا ہے۔۔''(3)

اس انفرادی شعور کا ایک اہم پہلو 'انتخاب' کا عمل بھی ہے۔ جب ایک ادبی مورخ ہزاروں تخلیق کاروں میں سے چند کا انتخاب کرتا ہے اور باقیوں کو نظرانداز کرتا ہے، تو یہ عمل بذاتِ خود ایک 'فیصلہ' اور 'رائے' ہے۔ سلیم اختر کے مطابق یہ انتخاب اٹکل پچو نہیں ہوتا بلکہ اس کی بنیاد مورخ کے تنقیدی شعور اور ترجیحات پر ہوتی ہے۔ اگرچہ ترجیحات اور تعصبات میں ایک باریک لکیر ہوتی ہے، لیکن سلیم اختر کا ماننا ہے کہ مورخ کو اپنی ترجیحات کو چھپانے کے بجائے دلیری سے ان کا اظہار کرنا چاہیے اور دلائل سے ثابت کرنا چاہیے کہ اس نے فلاں تخلیق کار کو کیوں منتخب کیا۔ یہ جراتِ اظہار اور قاطعیت ہی مورخ کو محض ایک نقل نویس بننے سے بچاتی ہے اور اسے ایک ناقد اور مفکر کے درجے پر فائز کرتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

''ویسے تو تخلیق کاروں یا تخلیقات کے انتخاب میں بھی بالواسطہ فیصلہ پنہاں ہوتا ہے مثلاً متعدد معاصرین سے صرف نظر کے بعد جب چند تخلیق کاروں کا مطالعہ کیا تو ایسا انتخاب یوں ہی اٹکل پچو نہیں ہوتا بلکہ رد و قبول پر مبنی ایسے انتخاب کی اساس کسی تخلیقی نظریہ، ادبی شعور یا تنقیدی حس پر استوار ہوتی ہے۔۔۔''(4)

اردو ادب کی تاریخ میں دبستانِ لکھنؤ کا مطالعہ ہمیشہ سے ایک متنازعہ اور پیچیدہ موضوع رہا ہے، جسے اکثر محض عیش و عشرت اور خارجی شاعری کا مرکز قرار دے کر یکسر مسترد یا محدود کر دیا جاتا رہا ہے۔ تاہم، جدید ادبی تاریخ نگاری میں اس دبستان کو سمجھنے کے لیے دو مختلف اور نمایاں زاویہ ہائے نگاہ سامنے آئے ہیں: ایک ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا سماجی و سیاسی (Socio-Political) تناظر اور دوسرا ڈاکٹر سلیم اختر کا نفسیاتی (Psychological) مطالعہ۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھنؤ کے ادبی ماحول کو وہاں کے مخصوص سیاسی حالات اور تہذیبی تبدیلیوں کا منطقی نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ وہ اس بات کا تجزیہ کرتے ہیں کہ جب اودھ کے حکمرانوں کے ہاتھ سے حقیقی سیاسی اور عسکری طاقت نکل گئی تو اس "سیاسی مجہولیت" نے اجتماعی نفسیات پر کیا اثر ڈالا۔ ان کے نزدیک لکھنؤ کی نشاطیہ فضا اور ثقافتی سرگرمیاں دراصل سیاسی بے بسی کا ردِ عمل تھیں، جہاں حکمرانوں اور عوام نے زندگی کی معنویت کو میدانِ جنگ کے بجائے بزمِ آرائی میں تلاش کیا:

''اودھ کی سیاسی مجہولیت نے آغاز ہی مجلسی زندگی کے نشاط میں پناہ تلاش کر لی تھی رفتہ رفتہ یہ پناہ گاہ ان کے طرزِ زندگی کا ایک مستقل روپ بن گئی جس میں حکمران طبقے کو بیک وقت پناہ اور عافیت نصیب ہوتی تھی... سیاسی و عسکری مجہولیت نے اودھ کو زندگی کے میدانِ عمل سے نکال کر مجلسی زندگی کے گوشۂ عافیت میں مقید کر دیا تھا''۔(5)

اس کے برعکس، ڈاکٹر سلیم اختر کا نقطہ نظر سماجیات سے زیادہ نفسیاتی حرکیات پر مبنی ہے۔ وہ لکھنؤ کے ادب کو وہاں کے حکمرانوں اور شعرا کی جنسی نفسیات، نسائیت (Femininity) اور داخلی محرکات کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اگرچہ تبسم کاشمیری بھی تہذیبی عوامل کا ذکر کرتے ہیں، لیکن سلیم اختر کا فوکس اس تہذیب کے "زوال آمادہ" نفسیاتی رویوں پر زیادہ مرکوز رہتا ہے۔ وہ لکھنؤ کے معاشرے میں عورت کی مرکزیت، طوائف کے کلچر اور واجد علی شاہ کی رنگین مزاجی کو ادبی رجحانات کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کے تجزیے میں ادب، معاشرتی ڈھانچے سے زیادہ انفرادی اور اجتماعی نفسیاتی گھٹن اور اس کے اظہار کا نام ہے۔ وہ اس دبستان کی جنسیت اور خارجیت کو محض اخلاقی گراوٹ نہیں کہتے بلکہ اسے اس عہد کی نفسیاتی سچائی کے طور پر پیش کرتے ہیں، تاہم ان کے اس تجزیے میں جنس اور نفسیات کا غلبہ اتنا شدید ہے کہ بعض اوقات تہذیبی پہلو دب جاتے ہیں:

''ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھنؤ کے معاشرے کا جائزہ تو پیش کیا ہے لیکن اس جائزے میں حکمرانوں کی عیش پرستی اور عورت پرستی کا ہی بار بار ذکر ملتا ہے۔ واجد علی شاہ کا ذکر بار بار کیا گیا ہے۔ اس کی محلاتی زندگی، طوائفوں کا ذکر،

پکوانوں میں اختراعات... گویا لکھنوی تہذیب کو نا صرف عورت کی تہذیب سمجھا گیا بلکہ پیش بھی اسی تناظر میں کیا ہے"۔(6)

ان دونوں مؤرخین کے موازنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جہاں تبسم کاشمیری نے دبستانِ لکھنؤ کو "تہذیبی کلّیت" میں رکھ کر دیکھا اور وہاں کے مذہبی کلچر (شیعیت اور مرثیہ نگاری) کو بھی سیاسی زوال کے پس منظر میں ایک تعمیری قوت کے طور پر پیش کیا، وہیں سلیم اختر نے مثنوی زہرِ عشق جیسی تخلیقات کو "اردو کی بدنام ترین مثنوی" جیسے چونکا دینے والے نفسیاتی عنوانات کے تحت جانچا۔ تبسم کاشمیری کا طریقہ کار متوازن اور معروضی ہے جو تعصبات کو رد کرتا ہے اور لکھنؤ کو دلی کی روایت کی توسیع قرار دیتا ہے، جبکہ سلیم اختر کا انداز قدرے "افسانوی" اور نفسیاتی ہے جو قاری کو چونکاتا ہے اور ادب کے پردے میں چھپی انسانی جبلتوں کو بے نقاب کرتا ہے:

"تبسم کاشمیری نے تاریخ نگاری میں لکھنؤ کے منفی اور مثبت دونوں زاویوں کو یکساں اہمیت دی ہے۔ جہاں خارجی مظاہر کا جائزہ لیا ہے وہیں فنی اور ثقافتی خصوصیات بھی زیرِ بحث آئی ہیں۔۔۔ مصنف اہلِ دلی کی شعری روایات کو اہلِ لکھنؤ کی شعری روایات کے مقابل رکھ کر ان کی مماثلتیں اور اختلافات بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس موازنے میں کہیں بھی کمتری کا احساس دکھائی نہیں دیتا"۔(7)

اردو کی لسانی تاریخ نگاری کے ارتقائی سفر میں دو واضح مکاتبِ فکر کا تصادم نظر آتا ہے۔ ایک جانب وہ ماہرینِ لسانیات ہیں جو زبان کو خالصتاً سائنسی اور تکنیکی اصولوں یعنی صوتیات (Phonetics)، فونیمیات (Phonemics)، صرف و نحو (Morphology & Syntax) اور ساختیاتی لسانیات کے پیمانوں پر پرکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک زبان کی تاریخ کا تعین سماجی میل جول سے زیادہ اس کے داخلی ڈھانچے، افعال اور اسمائے صفت کے اختتام (جیسے الف یا واؤ پر ختم ہونے والے الفاظ) کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ مسعود حسین خاں، شوکت سبزواری اور مرزا خلیل احمد بیگ اس تکنیکی دبستان کے سرخیل ہیں، جو زبان کے تہذیبی پس منظر سے زیادہ اس کی گرامر اور ساخت کو اہمیت دیتے ہیں۔ دوسری جانب ڈاکٹر سلیم اختر اور ان کے ہمنوا مورخین ہیں جو زبان کو لیبارٹری میں رکھے جانے والے کسی بے جان فارمولے کے بجائے ایک زندہ تہذیبی اور سماجی مظہر (Social Phenomenon) سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک لسانی تاریخ نگاری میں تکنیکی موشگافیوں سے زیادہ ان تاریخی ہجرتوں، مذہبی عوامل اور تمدنی اختلاط کا مطالعہ اہم ہے جن کی کوکھ سے زبان جنم لیتی ہے۔ یہ ٹکراؤ دراصل "زبان بطور ساختیاتی نظام" اور "زبان بطور تہذیبی عمل" کے مابین ہے۔

تکنیکی اصولوں کے علمبردار لسانی مورخین جب اردو کے آغاز کا سراغ لگاتے ہیں تو وہ تاریخی واقعات (جیسے مسلمانوں کی آمد) کو ثانوی حیثیت دیتے ہوئے زبان کے ڈھانچے کو بنیادی کسوٹی بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا خلیل احمد بیگ اور مسعود حسین خاں نے کھڑی بولی کو اردو کی اصل قرار دیا کیونکہ ان کے نحوی اور صرفی تجزیے (Morphological Analysis) کے مطابق اردو کا ڈھانچہ برج بھاشا یا پنجابی کے بجائے کھڑی بولی سے زیادہ مماثل ہے۔ یہ نقطہ نظر زبان کو تہذیبی فضا سے کاٹ کر اسے ریاضیاتی اصولوں کے تابع کر

دیتا ہے۔اس سائنسی اور خشک طریقہ کار کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

''اس لسانی حقیقت سے کہ اردو کی بنیاد کھڑی بولی پر قائم ہے، مسعود حسین خاں کو انکار نہیں۔ کھڑی بولی نواح دہلی (بجانب شمال مشرق) کی بولی ہے اور مغربی یوپی یعنی بالائی دوآبے میں میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور، بجنور، مرادآباد اور رام پور کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ کھڑی بولی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اسماء، ضمائر، صفات اور افعال بالعموم طویل مصوتے /a-/ یعنی الف [1-] پر ختم ہوتے ہیں، مثلاً بیٹا (اسم) میرا (ضمیر) بڑا (صفت) گیا (فعل)۔۔۔اس کے برخلاف برج بھاشا میں۔۔۔اسماء، ضمائر، صفات اور افعال ایک دوسرے مصوتے [o-] یعنی واؤ (و) پر ختم ہوتے ہیں''۔(8)

اس کے برعکس، ڈاکٹر سلیم اختر لسانی تاریخ نگاری میں ان خشک تکنیکی اصولوں سے شعوری گریز کرتے ہوئے تہذیبی عوامل کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ عام قاری کے لیے صوتیات اور فونیمیات کی بحثیں ''بھاری پتھر'' کی مانند ہیں، اس لیے وہ زبان کے ارتقا کو انسانی ہجرتوں اور سماجی نفسیات کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ان کے نزدیک یہ اہم نہیں کہ کس لفظ کا مادہ کس مصوتے پر ختم ہوا، بلکہ اہم یہ ہے کہ کس تاریخی اور جغرافیائی عمل نے دو قوموں کو یکجا کیا اور زبان کی تشکیل کا باعث بنا۔ وہ حافظ محمود شیرانی کے ''پنجاب'' والے نظریے کی تائید اس لیے نہیں کرتے کہ وہ لسانیاتی اعتبار سے سو فیصد درست ہے، بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ تاریخی اور تہذیبی منطق (مسلمانوں کی آمد اور سماجی انضمام) سے زیادہ قریب ہے۔ سلیم اختر تکنیکی پیچیدگیوں اور تہذیبی عوامل کے اس فرق کو واضح کرتے ہوئے اپنے عوامی اور سہل انداز کی وکالت یوں کرتے ہیں:

''ہمارے ہاں لسانیات کا جو معیاری کام ہوا اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں... لسانیات کی بعض اہم کتابوں میں جو نظریہ سازی ملتی ہے، اس کے باعث مواد کی پیش کش کسی مخصوص لسانی تصور کے تابع ہوتی ہے۔۔۔ان کتابوں کی اہمیت اور افادیت سر آنکھوں پر لیکن اس حقیقت سے اغماز ممکن نہیں کہ یہ صرف ماہرین کے کام آسکتی ہیں عام قارئین کے لئے یہ سب کچھ ''یونانی'' ثابت ہوتا ہے اور اسی کو میں نے ''اردو'' بنانے کی سعی کی ہے''۔(9)

لسانی تاریخ نگاری میں یہ ٹکراؤ ''اصطلاح سازی'' اور ''لغت نویسی'' کے مباحث میں بھی شدت اختیار کر جاتا ہے۔ تکنیکی ماہرین لسانیات اصطلاح وضع کرتے وقت لفظ کی اشتقاقی صحت (Etymological Accuracy) پر زور دیتے ہیں، چاہے وہ لفظ عوامی زبان کے لیے کتنا ہی اجنبی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس، سلیم اختر اور ان کے مکتبِ فکر کے مورخین زبان کو عمرانیات اور نفسیات کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی اصطلاح یا لفظ کا سکہ رائج الوقت ہونا لسانی اصولوں کا نہیں بلکہ ''سماجی تکییف (Social Conditioning)'' کا مرہونِ منت ہے۔ اگر کوئی لفظ تہذیبی قبولیت حاصل کر لے تو وہی درست ہے، چاہے وہ تکنیکی اعتبار سے غلط

العام ہی کیوں نہ ہو۔ وہ لسانی مباحث کو ٹیکنیکل لیبارٹری سے نکال کر سماج کے زندہ اور متحرک میدان میں لے آتے ہیں۔

ادبی تاریخ نگاری میں ادوار کی تقسیم (Periodization) محض ایک زمانی پیمانہ نہیں بلکہ ایک گہرا فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ روایتی اور خطی تاریخ نگاری (Linear Historiography) میں ادوار کا تعین عموماً بادشاہوں کے عہدِ حکومت (جیسے عہدِ شاہجہانی، عہدِ اورنگزیب) یا پھر صدیوں کے حساب سے کیا جاتا ہے، جو ادب کے داخلی بہاؤ اور فکری ارتقا کو سمجھنے کے لیے ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، جدید ادبی مورخین، بالخصوص ڈاکٹر سلیم اختر، ادوار کی تقسیم کے لیے ہیگل (Hegel) کے تصورِ "روحِ عصر (Zeitgeist)" کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اس فلسفے کے تحت ادب کی تاریخ کو محض سالوں اور تاریخوں کی سیدھی لکیر میں دیکھنے کے بجائے ایک نامیاتی کل (Organic Whole) کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جہاں کوئی بھی عہد محض شماریاتی اکائی نہیں ہوتا بلکہ ایک مخصوص فکری اور تہذیبی مزاج کا حامل ہوتا ہے۔ اس تصور کے تحت ادبی تاریخ کے اجزا (تنقید، کلچر، زبان) مل کر ایک وحدت تشکیل دیتے ہیں، جسے روحِ عصر کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے ادبی تاریخ کے اس فلسفیانہ پہلو کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> "ادبی تاریخ ایک کل ہے، اس میں تاریخ، تحقیق، کلچر، روایت، زبان اور تنقید بطور اجزا شامل ہیں۔ ادبی تاریخ کا یہ ایک خوش کن تصور ہے، جو بڑی حد تک ہیگل سے مستعار ہے۔ ہیگل تاریخ کو کل سمجھتا تھا۔ اس کل کو اس نے روحِ عصر یا Zeitgeist کا نام دیا تھا۔ تاریخ کا یہ "کلی تصور"، تنقید کو محض ایک جُز سمجھتا ہے۔۔۔"(10)

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس فلسفے کا عملی اطلاق اردو ادب کی تاریخ کے اس دور پر کیا ہے جسے عام طور پر سرسید تحریک اور ترقی پسند تحریک کے درمیان ایک خلا یا محض گزرگاہ سمجھا جاتا تھا۔ خطی ترتیب کے عادی مورخین اکثر انیسویں صدی کے آخر اور ۱۹۳۶ء کے درمیان کے عرصے کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا اسے محض تمہید کے طور پر دیکھتے ہیں۔ تاہم، سلیم اختر نے اسے "عبوری دور (Interim Period)" کا نام دے کر اس کی الگ سے شناخت قائم کی۔ ان کے نزدیک یہ دور کسی اجتماعی تحریک کا پابند نہیں تھا بلکہ یہ "انفرادیت کے عروج" کا زمانہ تھا، جہاں رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، ہادی رسوا اور ڈپٹی نذیر احمد جیسی شخصیات اپنے اپنے انفرادی رنگ میں ادبی افق پر چھائی ہوئی تھیں۔ یہ تقسیم ظاہر کرتی ہے کہ ادبی ادوار ہمیشہ تحریکوں کے تابع نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات "روحِ عصر" انفرادی صلاحیتوں کے تنوع میں ظاہر ہوتی ہے۔ سلیم اختر نے اس عبوری دور کی معنوی اہمیت کو یوں اجاگر کیا ہے:

> "یہ ان ادیبوں اور شعرا کا تذکرہ ہے جو بلحاظ زمانہ یا پھر مخصوص فکری سانچوں اور طرز احساس کی بنا پر ترقی پسند ادب کی تحریک سے قبل گنے جا سکتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ سرسید تحریک کے بعد ۱۹۳۶ء تک اردو ادب میں اور کوئی باضابطہ ادبی تحریک نہیں ملتی۔ اسی لیے بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر ۱۹۳۶ء بلکہ اس کے بعد بھی قلمی اور جسمانی زندگی کے باوجود بھی یہ "عبوری"، نہیں کہ اپنے مخصوص انداز فکر یا انداز نگارش کو ترقی پسند تحریک کے دوران بلکہ زمانہ عروج میں بھی برقرار رکھا بلکہ ان کی انفرادیت ہی اس میں ہے کہ انہوں نے اپنی انفرادیت نہ گنوائی"۔(11)

اس فلسفیانہ تقسیم کی معراج ڈاکٹر سلیم اختر کے ہاں علامہ اقبال کی شخصیت میں نظر آتی ہے۔ وہ اقبال کو محض ایک شاعر کے خانے میں قید کرنے کے بجائے انہیں اس عبوری دور کے منطقی نتیجے اور ''روحِ عصر'' کے سب سے بڑے مظہر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ خطی تاریخ میں اقبال کو بیسویں صدی کے شعرا کی فہرست میں ایک نام کے طور پر درج کیا جا سکتا ہے، لیکن ''روحِ عصر'' کے فلسفے کے تحت اقبال اس پورے عہد کی فکری، تہذیبی اور مابعد الطبیعیاتی بے چینیوں کا واحد اور مکمل جواب بن کر ابھرتے ہیں۔ سلیم اختر کے نزدیک عبوری دور کی تمام تر تخلیقی زرخیزی (جسے وہ ادبی کھاد کہتے ہیں) دراصل اقبال کی عبقری شخصیت کی آبیاری کے لیے تھی۔ یہاں مورخ کا کام محض واقعات کی ترتیب نہیں رہتا بلکہ وہ ایک مفکر کی طرح اس نقطے کو دریافت کرتا ہے جہاں ایک فرد پورے عہد کا ترجمان بن جاتا ہے۔

ادبی تاریخ نگاری میں تحریکوں کا مطالعہ مورخ کے لیے ایک کڑا امتحان ہوتا ہے، کیونکہ اسے محض واقعات کی ترتیب و تدوین نہیں کرنی ہوتی بلکہ ان فکری لہروں اور نظریاتی کشمکش کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرنا ہوتا ہے جنہوں نے ادب کا دھارا تبدیل کیا۔ بیسویں صدی میں اردو ادب پر اثر انداز ہونے والی دو بڑی تحریکوں، یعنی ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق، کے حوالے سے مورخین، بالخصوص ڈاکٹر سلیم اختر کا رویہ ایک خاص بصیرت کا حامل ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کو اردو کی سب سے توانا مگر ''نزاعی'' تحریک قرار دیتے ہیں۔ مورخ کا یہ کام ہے کہ وہ دیکھے کہ کس طرح ایک تحریک نے ادب کو ''کاروبارِ دل'' سے نکال کر ''کاروبارِ دنیا'' اور عوامی جدوجہد کا نقیب بنایا۔ سلیم اختر ترقی پسند تحریک کے اشتراکی پس منظر اور اس کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس تحریک نے پہلی بار ادیب کو کسی مخصوص خطے یا نسل کے بجائے ''عوام'' کا ترجمان بنایا اور ادب میں طبقاتی کشمکش کا شعور بیدار کیا۔ تاہم، وہ اس بات سے بھی چشم پوشی نہیں کرتے کہ اس نظریاتی شدت پسندی نے ادب کو بعض اوقات پروپیگنڈا بنا دیا، جس کے ردعمل کا آنا فطری تھا۔

مورخ کا رویہ اس وقت مزید اہمیت اختیار کر جاتا ہے جب وہ ترقی پسند تحریک کے متوازی یا ردعمل میں ابھرنے والے رجحانات کا جائزہ لیتا ہے۔ حلقہ اربابِ ذوق کا قیام دراصل اس بات کا اعلان تھا کہ ادب کا مقصد محض سماجی اصلاح یا سیاسی نعرہ بازی نہیں، بلکہ ذات کا اظہار اور فنی جمالیات بھی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر حلقہ اربابِ ذوق کو ترقی پسندوں کی ''ضد'' اور ایک ضروری ردعمل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ تجزیہ کرتے ہیں کہ جہاں ترقی پسندوں نے ''غمِ دوراں'' کو اولیت دی، وہاں حلقے کے ادیبوں، بالخصوص میراجی اور ن م راشد نے داخلیت، ابہام اور نفسیاتی گرہوں کو موضوع بنایا۔ مورخ یہاں یہ باریک نکتہ اٹھاتا ہے کہ حلقے کا یہ رجحان دراصل فرانسیسی علامت پسندی اور ''ادب برائے ادب'' کے نظریے کا پرتو تھا، جو ترقی پسندوں کے ''ادب برائے زندگی'' کے نعرے کی نفی کر رہا تھا۔ سلیم اختر نے اس ادبی و فکری تصادم اور حلقے کے نمایاں خدوخال کو ان الفاظ میں محفوظ کیا ہے:

> ''حسن عسکری ہر لحاظ سے ترقی پسندوں کے برعکس ہیں۔ وہ ادب برائے زندگی کے نہیں بلکہ ادب برائے ادب کے قائل ہیں۔ مواد کو نہیں بلکہ اسلوب کو اہمیت دیتے ہیں اور ان فرانسیسی (سارتر، بودلیئر، ملارمے) سے متاثر ہیں جنہیں ترقی پسند زوال اور انحطاط کی علامت سمجھتے ہیں۔۔۔ میراجی کا حلقہ ارباب ذوق ترقی پسند مصنفین کے

متوازی چلتا رہا۔یوں محدود اور مقامی حیثیت کے باوجود اسے بھی مخصوص رجحانات کے باعث رد عمل کا ایک پلیٹ فارم قرار دیا جاسکتا ہے"۔(12)

اس تجزیے میں مورخ کا کام صرف فریقین کے دلائل پیش کرنا نہیں، بلکہ ادب پر ان کے دور رس اثرات کا تعین کرنا بھی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر انور سدید جیسے مورخین اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ اگر ترقی پسند تحریک نے اردو افسانے اور ناول کو سماجی حقیقت نگاری اور مزاحمت کا درس دیا، تو حلقہ اربابِ ذوق نے شاعری میں آزاد نظم، نئی ہیئتوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو متعارف کرایا۔ حلقے کے شعرانے داخلیت کا وہ رجحان پیدا کیا جس نے نظم کو نعرے سے بچا کر ایک لطیف تجربہ بنا دیا۔ مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان دونوں تحریکوں نے اپنے اپنے دائرے میں اردو ادب کی ثروت میں اضافہ کیا۔ ایک نے ادب کو زمین اور عوام سے جوڑا تو دوسرے نے اسے انسانی نفسیات اور تہذیبی علامتوں کی گہرائی عطا کی۔ حلقہ اربابِ ذوق کی اسی تخلیقی دین کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> "میراجی اس گروہ کے سب سے زیرک، باکمال اور تخلیقی لحاظ سے خلاق شاعر تھے۔ چنانچہ انہوں نے اُردو نظم میں داخلیت کا وہ رجحان پیدا کیا جس کی ابتداء تصدق حسین خالد اور ن۔م۔راشد کر چکے تھے۔ان تینوں شعراء کی اساسی عطیہ ہے کہ انھوں نے پابند نظم کی مقبولیت کے دور میں آزاد اور معرّٰی نظم کو اہمیت دی۔"(13)

اردو ادبی تاریخ نگاری کی روایت میں اسالیب کے تنوع نے دو واضح اور متوازی رجحانات کو جنم دیا ہے۔ایک جانب وہ تحقیقی اور ضخیم طرزِ نگارش ہے جسے ہم "انسائیکلوپیڈیا" یا تفصیلی تاریخ نگاری سے تعبیر کر سکتے ہیں، اور دوسری جانب وہ جدید اور سہل پسندانہ رویہ ہے جسے "کیپسول" یا اختصار پسند تاریخ نگاری کا نام دیا گیا ہے۔ تفصیلی تاریخ نگاری کی نمائندگی ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری جیسے مورخین کرتے ہیں، جن کے نزدیک تاریخ کا دامن اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ وہ سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی عوامل کی تمام تر جزئیات کو اپنے اندر سمولے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی چار جلدوں پر مشتمل تاریخ اس تفصیلی منہاج کی بہترین مثال ہے، جہاں ہر دور کو اس کے مکمل پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ محض مقالات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مربوط اور مبسوط دستاویز ہے۔اس تفصیلی اسلوب کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری کو کسی اور مآخذ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ رہے اور وہ ایک ہی جگہ پر صدیوں کا علمی احاطہ کر سکے:

> "میرا کام جسے میں نے تاریخ ادب اُردو کا نام دیا ہے چار جلدوں میں ہے۔اس کی پہلی جلد آپ کے سامنے ہے جو آغاز سے لے کر ۱۷۵۰ء تک قدیم اُردو زبان و ادب کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ جلد اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور دوسری جلد سے مربوط و پیوستہ بھی۔ واضح رہے کہ یہ جدید انداز کی مربوط تاریخ ہے، متفرق مقالات کا مجموعہ یا تذکرہ نہیں ہے"۔(14)

اس کے برعکس، ڈاکٹر سلیم اختر نے تاریخ نگاری میں "کیپسول" کا تصور متعارف کرایا، جس کا بنیادی وصف 'اختصار' اور

'جامعیت' ہے۔ان کا ماننا ہے کہ جدید دور کا قاری ضخیم جلدوں اور بوجھل تفصیلات کا متحمل نہیں ہو سکتا، لہٰذا تاریخ کو اتنا مختصر اور پر اثر ہونا چاہیے کہ وہ کم سے کم وقت میں ادب کی روح اور ارتقائی سفر کا مکمل ادراک فراہم کر سکے۔ سلیم اختر کی ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''اسی فلسفے کی عکاس ہے، جسے انہوں نے ایک ادبی کیپسول قرار دیا ہے۔اس اسلوب میں مورخ کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ تفصیلات کے سمندر کو کوزے میں بند کرتا ہے اور غیر ضروری جزئیات کو حذف کر کے صرف ان نکات پر توجہ مرکوز کرتا ہے جو تاریخی اور تنقیدی اعتبار سے ناگزیر ہوں۔ان کے اس اسلوب میں جہاں ایک طرف معلومات کی فراہمی ہے، وہیں دوسری طرف ایک ایسا افسانوی اور دلچسپ انداز ہے جو تاریخ کی خشکی کو ختم کر دیتا ہے۔ ناقدین نے اس کتاب کو اس کی جامعیت کی بنا پر ایک مختصر انسائیکلوپیڈیا بھی قرار دیا ہے جو طلبہ اور عام قاری کے لیے فوری حوالے کا کام دیتا ہے:

> ''اختصار اس کتاب کا نمایاں وصف ہے اور بقول مصنف یہ کتاب ایک ادبی کیپسول کی مانند ہے جو اردو زبان و ادب کی ضروری معلومات، اساسی کوائف اور موزوں آراء فراہم کر دے۔۔۔ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب کو ادبی تاریخ کے بجائے اردو ادب کا انسائیکلوپیڈیا کہنا زیادہ بہتر ہے''۔(15)

تفصیلی اور مختصر تاریخ نگاری کا یہ موازنہ اس وقت مزید واضح ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری جیسے مورخین کسی بھی عہد کے ادب کا جائزہ لینے سے قبل اس دور کی اقتصادیات، دیومالا، اور فلسفے کا کئی کئی صفحات پر محیط تجزیہ پیش کرتے ہیں، جبکہ سلیم اختر اسی مواد کو چند پیراگراف یا صفحات میں سمیٹ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر دبستانِ لکھنؤ کی دو سو سالہ تاریخ کو سلیم اختر نے محض اکتیس صفحات میں سمیٹ دیا ہے، لیکن اس اختصار کے باوجود انہوں نے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پہلوؤں کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ یہ ایجاز و بلاغت اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر سلیم اختر کے اسلوب کو تفصیلی مورخین سے جدا کرتا ہے۔ جہاں تفصیلی تاریخ محققین کے لیے ایک ریفرنس بک کا درجہ رکھتی ہے، وہاں سلیم اختر کی کیپسول نما تاریخ ادبی ذوق کی تسکین اور فوری معلومات کا ذریعہ بنتی ہے۔

اس تفصیلی اور تقابلی مطالعے کے بعد ہم جن نتائج پر پہنچتے ہیں، وہ اردو ادبی تاریخ نگاری کے مستقبل کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ سب سے پہلا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ ادبی تاریخ اب محض ''واقعہ نگاری'' کے دائرے میں مقید نہیں رہ سکتی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی کاوشوں نے ثابت کیا ہے کہ ادب کو سیاسی، معاشی اور تہذیبی پس منظر سے الگ کر کے دیکھنا ایک ادھورا عمل ہے۔ دوسری جانب، ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخ نگاری نے یہ اہم اور منفرد نتیجہ فراہم کیا ہے کہ ''غیر جانبداری'' کا روایتی تصور ایک ڈھکوسلا ہے۔ مورخ کے لیے اپنی ''ذاتی رائے''، ''قاطعیت'' اور ''نفسیاتی بصیرت'' کا استعمال ناگزیر ہے، ورنہ تاریخ محض مردہ اعداد و شمار کا ڈھیر بن جائے گی۔

مزید برآں، لسانی تاریخ نگاری کے تجزیے سے یہ بات سامنے آئی کہ تکنیکی اور خشک لسانی اصولوں (جیسے صوتیات و صرف و نحو) کے مقابلے میں زبان کو ایک ''تہذیبی اور سماجی مظہر'' کے طور پر پیش کرنے کا انداز (سلیم اختر کا اسلوب) عام قاری کے لیے زیادہ سود مند اور قابلِ فہم ہے۔ ادوار کی تقسیم کے حوالے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ خطی ترتیب (Linear order) کے بجائے ''روحِ عصر''

(Zeitgeist)کا فلسفہ زیادہ کار گر ہے، جس کے تحت اقبال جیسی شخصیات کو محض ایک شاعر نہیں بلکہ پورے عہد کا نمائندہ قرار دیا جاتا ہے۔اسلوب کے اعتبار سے یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچی کہ ''انسائیکلوپیڈیا''(تفصیل)اور ''کیپسول''(اختصار)دونوں اسالیب کی اپنی اپنی افادیت ہے؛پہلا محققین کے لیے حوالہ کا کام دیتا ہے اور دوسرا ادبی ذوق کی تسکین اور فوری ابلاغ کے لیے مؤثر ہے۔

فراہم کردہ مواد اور تحقیقی جائزے کی روشنی میں، مستقبل کی ادبی تاریخ نگاری کے لیے درج ذیل پانچ سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

مستقبل کے مورخین کو چاہیے کہ وہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے ''سماجی و سیاسی تناظر'' اور ڈاکٹر سلیم اختر کے ''نفسیاتی تجزیے'' کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کے بجائے ان کا امتزاج پیدا کریں۔ کسی بھی دبستان (جیسے لکھنؤ) یا شخصیت (جیسے میر و غالب) کا مطالعہ کرتے وقت خارجی حالات کے ساتھ ساتھ داخلی اور لاشعوری محرکات کو بھی یکجا کیا جانا چاہیے تاکہ تصویر کا مکمل رخ سامنے آسکے۔

ادبی تاریخ کو بادشاہوں کے ناموں یا صدیوں کے حساب سے تقسیم کرنے کے فرسودہ طریقے کو ترک کر کے ہیگل کے تصورِ ''روحِ عصر'' (Zeitgeist) کو اپنانا چاہیے۔ادوار کا تعین ان شخصیات یا رجحانات کی بنیاد پر کیا جائے جنھوں نے اپنے عہد کے فکری دھارے کو تبدیل کیا۔

لسانی تاریخ نگاری کو ماہرینِ لسانیات کی تکنیکی اصطلاحات اور لیبارٹری کے خشک ماحول سے نکال کر اسے تہذیبی اور عوامی سطح پر لانے کی ضرورت ہے۔ مورخین کو چاہیے کہ وہ ڈاکٹر سلیم اختر کی تقلید میں زبان کے ارتقا کو ہجرتوں، سماجی میل جول اور تہذیبی ضروریات کے پس منظر میں بیان کریں تاکہ یہ علم خشک ہونے کے بجائے دلچسپ اور بامعنی بن سکے۔

مؤرخین کو مشرقی مروت اور بزرگوں کے احترام کے نام پر حقائق کی پردہ پوشی سے گریز کرنا چاہیے۔ڈاکٹر سلیم اختر کے اصول کے مطابق، ''ذاتی رائے'' اور ''فیصلہ کن موقف'' اختیار کرنا مورخ کا بنیادی فریضہ ہے۔ مستقبل کی تاریخوں میں تخلیق کاروں کے انتخاب اور رد کے عمل میں واضح تنقیدی معیار اور جراتِ رندانہ کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔

موجودہ دور کی مصروفیات اور قاری کے مزاج کو دیکھتے ہوئے، ضخیم جلدوں کے ساتھ ساتھ ''مختصر ترین تاریخیں'' لکھنے کی روایت کو فروغ دینا چاہیے۔تاہم، اس اختصار میں یہ احتیاط لازم ہے کہ ادبی اور تہذیبی حقائق کی روح مجروح نہ ہو، اور قاری کو کم وقت میں ادب کا جامع تہذیبی شعور اور ارتقائی سفر سمجھ میں آسکے۔

حوالہ جات

1. ڈاکٹر گیان چند جین، اردو کی ادبی تاریخیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۷
2. ڈاکٹر سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ آغاز سے ۲۰۰۰ء تک، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۲۲
3. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص 16

4. ڈاکٹر سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ؛ آغاز سے ۲۰۰۰ء تک، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۵ء، ص 22

5. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص 381

6. ڈاکٹر حنا کنول، ''ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر سلیم اختر کی ادبی تاریخ نگاری اور دبستانِ لکھنؤ''، مشمولہ: سہ ماہی ماخذ، ۲۰۲۱ء، ص ۲۷۹، ۲۸۰

7. ایضاً، ص ۲۷۳

8. مرزا خلیل احمد بیگ، اردو کی لسانی تشکیل، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۷ء، ص ۷۰

9. ڈاکٹر سلیم اختر، اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۷

10. ڈاکٹر ناصر عباس نیر، لسانیات اور تنقید، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء، ص 86

11. ڈاکٹر سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ آغاز سے ۲۰۰۰ء تک، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۵ء، ص 405

12. ایضاً، ص ۴۶۱

13. انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، طبع نہم، ص 519

14. جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو، (جلد اول) قدیم دور (آغاز سے ۱۷۵۰ء تک)، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ص ح

15. ڈاکٹر حنا کنول، ''ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر سلیم اختر کی ادبی تاریخ نگاری اور دبستانِ لکھنؤ''، ص ۲۷۸، ۲۸۰

References in Roman

1. Jain, G. C. (2000). *Urdu ki Adabi Tareekhen*. Anjuman Taraqqi Urdu Pakistan. p. 27
2. Akhtar, S. (2005). *Urdu Adab ki Mukhtasar Tareen Tareekh: Aaghaz se 2000 tak*. Kitabi Duniya. p. 22
3. Kashmiri, T. (2012). *Urdu Adab ki Tareekh: Ibtida se 1857 tak*. Sang-e-Meel Publications. p. 16
4. Akhtar, S. (2005). *Urdu Adab ki Mukhtasar Tareen Tareekh: Aaghaz se 2000 tak*. Kitabi Duniya. p. 22
5. Kashmiri, T. (2012). *Urdu Adab ki Tareekh: Ibtida se 1857 tak*. Sang-e-Meel Publications. p. 381
6. Kanwal, H. (2021). Dr. Tabassum Kashmiri aur Dr. Saleem Akhtar ki Adabi Tareekh Nigari aur Dabistaan-e-Lucknow. *Sah Maahi Maakhaz*, pp. 279–280
7. Ibid., p. 273
8. Baig, M. K. A. (2017). *Urdu ki Lisani Tashkeel*. Educational Book House. p. 70

9. Akhtar, S. (2008). *Urdu Zaban ki Mukhtasar Tareen Tareekh*. Educational Publishing House. p. 7
10. Nayyar, N. A. (2015). *Lisanayat aur Tanqeed*. Anjuman Taraqqi Urdu Hind. p. 86
11. Akhtar, S. (2005). *Urdu Adab ki Mukhtasar Tareen Tareekh: Aaghaz se 2000 tak*. Kitabi Duniya. p. 405
12. Ibid., p. 461
13. Sadeed, A. (n.d.). *Urdu Adab ki Tehreeken* (9th ed.). Anjuman Taraqqi Urdu Pakistan. p. 519
14. Jalibi, J. (n.d.). *Tareekh-e-Adab-e-Urdu* (Vol. 1). Majlis Taraqqi Adab. p. H
15. Kanwal, H. (2021). Dr. Tabassum Kashmiri aur Dr. Saleem Akhtar ki Adabi Tareekh Nigari aur Dabistaan-e-Lucknow. pp. 278–280
16- Dr Shabbir Ahmad Qadri, & Muhammad Farooq Baig. (2022). ARMAGHAN E ILMI AND RESEARCH. Zaban-O-Adab, 15(2), 296-307. Retrieved from //zabanoadab.gcuf.edu.pk/index.php/1/article/view/26